Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی مکھیوں کو اُڑاتا جا رہا تھا۔ رحیم شربت والے نے ایک دفعہ اسی جگہ پر تنِ تنہا سات ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر اس زمانے میں رحیم ململ کا کرتہ پہنتا تھا اور اس کے پٹھوں کی مضبوط ڈھلان اور شانوں کی گولائی اور بازوؤں کی مچھلیاں ململ میں سے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس کے چہرے پہ سفید داڑھی تھی اور وہ مشکل سے پہچانا جاتا تھا۔ فیلڈ کی آڑ میں اس نے کئی اور لوگوں کو پہچانا جو اپنی پرانی دکانوں پہ اپنے مستقل انداز میں بیٹھے تھے۔ کئی لوگوں نے اسے دیکھا اور گزر گئے اور پھر مڑ کر اس کی چال سے کچھ اندازہ کرنے اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر بیس سال ایک عمر ہوتی ہے جو بچوں کو جوان اور جوانوں کو بوڑھا اور یادوں کو کند کر دیتی ہے۔ وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے دہنے ہاتھ کی ایک گلی میں مڑ گیا۔

گلی کا فرش، اونچی نیچی اینٹوں والا، اس کا سارا لاپروا ماضی تھا جس پر ان گنت پرانے قدموں کے نشان تھے جن میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس نے گلی کو تقریباً خالی پا کر ہیٹ ماتھے پر اونچا کیا اور انگلیاں اپنے بیٹے کے بالوں میں دوڑائیں۔ بازار کا اونچی نیچی آوازوں والا اُٹھتا اور دبتا ہوا شور پیچھے رہا جا رہا تھا۔ اب یہاں پہ گلی کی مخصوص آوازیں تھیں۔ دونوں طرف کے چوباروں کی کھڑکیوں میں آمنے سامنے بیٹھ کر سبزی بناتی اور آہستہ آہستہ باتیں کرتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو جھانکتی ہوئی عورتوں کی مخمور آوازیں اور اندر کسی کواڑ کے کھلنے اور بند ہونے کی پراسرار دھمک (ٹھنڈے، اندھیرے کمروں میں ان گنت سستاتے اور ان دیکھی محبت کرتے ہوئے مردوں اور عورتوں کی پُراسرار دھمک!) اور سہ پہر کا سناٹا! اس کا جی چاہا کہ وہ پرانے وقتوں کی مانند بازو پھیلا کر بھاگتا اور شور مچاتا ہوا اس گلی میں سے گزرے، مگر وہ حجاب آلود اجنبیت کا احساس پھر اس کے آڑے آ گیا اور وہ بازو اپنے بیٹے کی گردن میں ڈالے احتیاط سے پرانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشانوں پہ قدم رکھتا ہوا کڑی مستقل چال سے، جو ادھیڑ عمری کی اور زیارت کے سفر کی چال ہوتی ہے، گزرتا رہا، اور چوباروں کی کھڑکیوں میں ٹیک لگائے بیٹھی لڑکیوں نے سانس روکے بغیر گردن لمبی کر کے اس باپ بیٹے کو جھانکا اور دھیان ہٹا لیا، اور دوپہر کے کھانے کے بعد خنک، تاریک کمروں میں محبت کرنے اور پھر گہری نیند میں بڑبڑانے والے ان گنت مردوں اور عورتوں کو ان کا پتا بھی نہ چلا۔ اب یہ اس کے دوست اوم کا گھر تھا جس کی بہن لیشپا ہر سال اس کے راکھی باندھا کرتی تھی اور اب وہ لوگ پتا نہیں کہاں تھے۔ اس وقت وہ سب پرائمری سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ اور ہفتے میں ہمیشہ ایک دو روز لیشپا اس سے کہتی: "آج ہم نے ترکاری پکائی ہے ——" اور وہ سیدھا ان کے گھر چلا جاتا اور ان کے دالان کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر وہ تینوں ہلکی ہلکی گول چپاتیوں کے ساتھ پیتل کے جھلملاتے ہوئے برتنوں میں ترکاری کھاتے اور بعد میں ان کے چوبارے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر کھیلتے اور اس کے گھر والوں کو اس کی فکر بھی نہ ہوتی، کیونکہ اس زمانے میں اس کے دو گھر تھے —— ایک اپنا اور ایک اوم اور لیشپا کا۔ اس نے رک کر کھلے دروازے میں سے اندر جھانکا: دالان اور چوکا اور ایک کوٹھڑی اور دائیں طرف کو اوپر جاتا ہوا زینہ، سب جگہیں وہی تھیں، صرف کنبہ اجنبی تھا۔ دالان کے فرش پہ بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہوئی بوڑھی عورت نے اپنی بے رنگ آنکھیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا ہے بھائی ——"

وہ چھت کی کڑیوں پر نظر دوڑاتا رہا۔

"کس کو دیکھنے ہو بھائی ——؟" بڑھیا نے دوبارہ پوچھا۔

"کسی کو نہیں بی بی ——" اس نے آہستہ سے کہا۔ چرخے کے پاس روئی کے ڈھیر کو دیکھ کر اس نے بے خیالی سے سوچا، "یہ شاید اس سال کی ہے!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر اس نے اپنے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اور چل پڑا۔

اس گھر سے ایک خنک سی، نامعلوم سی بُو آیا کرتی تھی جو اوم اور پشپا سے بھی آتی تھی۔ اس نے یاد کیا۔ اور جب کبھی وہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو جایا کرتا تو پھر جاگنے پر، آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی، اسے پتا چل جاتا تھا کہ وہ اس گھر میں ہے اور پھر آنکھیں کھول کر پیپل کے کٹوروں اور تھالیوں کو تاریک چوکے کی دیواروں پر جھلملاتے ہوئے دیکھتا تھا اور اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور اب یہ گھر اجنبی اور بے بُو ہو چکا تھا جو کبھی اس کا اپنا تھا، اس نے سوچا۔ سب چیزیں وہی تھیں صرف بُو اُڑ چکی تھی، اس نے دل میں کہا، بُو جو لامقام ہوتی ہے مگر بدن ضرور رکھتی ہے، جو سفر کرتی رہتی ہے مگر مرتی بھی ہے۔

اب وہ اپنے سکول کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس سکول کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کے گھروں کے پاس تھا چنانچہ اس علاقے کے سب بچے یہیں سے تعلیم شروع کرتے تھے۔ یہ سکول کا پچھواڑا تھا جہاں اس کا ایک دروازہ اور باقی کھڑکیاں تھیں۔ دروازہ لوہے کی سلاخوں کا بنا ہوا تھا جیسے جیلوں یا خزانوں کا ہوتا ہے، اور کھڑکیوں میں بھی سلاخیں لگی تھیں۔ سکول کا اصل گیٹ پیچھے کی طرف تھا جہاں سے گول سڑک گزرتی تھی۔ اس نے بچے کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور جا کر کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور قیدیوں کی طرح ان سے منہ لگا کر اندر دیکھنے لگا۔ سکول میں چھٹی ہو چکی تھی اور چپراسی کمروں کو بند کر رہے تھے اور برآمدوں میں ماسٹر اپنی اپنی سائیکلوں پہ جھکے گپیں مار رہے تھے۔ یہ چوتھا درجہ تھا، اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ بے ترتیبی سے پڑے ہوئے بدرنگ ڈیسکوں پر سیاہیوں کے دھبے تھے اور بلیک بورڈ پہ تقسیم کا ایک سوال حل کیا ہوا تھا جو پھر ڈسٹر سے آدھا مٹا دیا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علامہ اقبال کی تصویر ٹیڑھی ہو کر لٹک رہی تھی۔ یہ چوتھا درجہ ہے، اس نے دل میں دوہرایا۔ یہاں وہ ایک سال تک بیٹھتا رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکا بیٹھتا تھا جس کے کپڑوں سے گندے صوف کی سیاہی کی بو آیا کرتی تھی۔ مگر اس سے آگے جو لڑکا بیٹھتا تھا اس سے گیلی گاچنی اور تازہ تراشی ہوئی قلموں کی کھری کھری خوشبو آیا کرتی تھی جو اسے بڑی اچھی لگتی تھی مگر اس کی دوستی صرف اوم اور پشپا سے تھی جو دوسری قطار میں بیٹھتے تھے اور ان کے اپنے دوست تھے جو دوسری قطار کے تھے۔ اور آدھی چھٹی کے وقت نلکے کے گرد سب جمع ہو کر اپنی اپنی تختی پر گاچنی ملتے تھے اور جب کوئی تختی پر ہاتھ پھیرنے کے لیے گاچنی کی ڈلی کو ایک طرف رکھتا تو چپکے سے اسے اُٹھا کر اپنی تختی پر مل لیتے تھے اور پھر وہیں رکھ دیتے تھے اور ہجوم کی گڑبڑ میں کسی کو پتا بھی نہ چلتا تھا۔ اس نے آہستہ سے سلاخوں سے منہ اُٹھایا اور ہاتھ سے اس جگہ کو ملا جہاں اس کے ماتھے پر سلاخوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کے بالوں میں اُنگلیاں دوڑائیں اور آہستہ سے ہنسا اور وہ دونوں پھر گلی میں چلنے لگے۔ اب یہ وہ مکان تھا جو سکول کے ساتھ لگتا تھا اور جو اس کے لیے بڑا اسرار رکھتا تھا۔ اس مکان کو دیکھتے ہی اسے وہ شخص یاد آ گیا جو یہاں رہا کرتا تھا۔ وہ پینتالیس پچاس کے لگ بھگ، دبلا پتلا اور لمبے قد کا آدمی تھا جو خاکساروں کی وردی پہنے رہتا تھا جس کی جیبوں میں ہر وقت اردو کی اخباریں اور پرچے ٹھنسے رہتے۔ اس کے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی جس میں چند پرانی عینکیں لٹکتی رہتی تھیں۔ کہنے کو وہ عینکوں کا کاروبار کرتا تھا، مگر کسی نے اس کو کبھی عینکیں بیچتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کا صرف ایک کام تھا، کہ بازار میں سائیکل لے کر چلتے چلتے ہر چند قدم پر رک جاتا اور اپنی گہری آواز میں نعرہ لگاتا — "چور اُچکا چودھری اور غنڈی رن پردھان" اور پھر بچوں کے معصوم فاتحانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا تھا اور ارد گرد کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکاندار اور گزرنے والے لوگ اس کی طرف اپنائیت سے دیکھتے تھے اور کھسیا کر ہنستے تھے کہ جیسے وہ اس نعرے کا نشانہ نہ ہونے کے باوجود اس میں شریک تھے۔ وہ شخص بھی نعرہ لگانے کے بعد خوشدلی سے ہنستا اور گزر جاتا۔ اس شخص کے لہجے میں اور چہرے پر کوئی کڑواہٹ نہ ہوتی بلکہ صرف خوش دلی اور بے ضرر طنز کے آثار ہوتے تھے جو اس کی شکل صورت اور چال ڈھال سے ذرا میل نہ کھاتے تھے۔ وہ ہر ایک کا دوست معلوم ہوتا مگر کسی نے اس کو کبھی کسی کے پاس رکتے نہ دیکھا تھا۔ وہ لوگ صبح سویرے سکول پہنچنے پر اس کو اپنی سائیکل کے ساتھ گھر سے نکلتے اور دروازے کو تالا لگاتے ہوئے دیکھتے اور کھڑے رہتے جب تک کہ وہ گلی میں اُتر کر اپنی گہری اور بلند آواز میں بلانا غہ ــــ "چورا چکا چودھری اور غنڈی رن پہ دھان۔" کا نعرہ لگا کر اور اپنے معصوم فاتحانہ انداز میں سارے بچوں پہ نظر ڈال کر بازار کی طرف نہ چلا جاتا۔ جس روز وہ مرا ہے کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ تین روز تک دروازہ اندر سے مقفل رہا تھا ــ اس نے یاد کیا ــ حتیٰ کہ تیسرے روز بُو باہر نکل کر چاروں طرف پھیل گئی تھی اور سب سے پہلے سکول کے ماسٹروں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور چند بچوں نے۔ جو اس آواز پہ جمع ہو گئے تھے ــ اُنہیں بتایا کہ آج تین روز سے انہوں نے چورا چکے چودھری کو نہیں دیکھا دیکھا تھا۔ چنانچہ پہلے محلے کے لوگ جمع ہوئے، پھر پولیس آئی اور کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے اور آوازیں دینے اور درزوں میں سے جھانکنے کی کوشش کرنے کے بعد دروازہ توڑا گیا اور اندر وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ جیسے عام لوگ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ صرف اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا اور میز پہ ایک کاغذ اور قلم رکھا تھا اور کاغذ پہ ــ یہ اس کو بہت بعد میں پتا چلا تھا ــ لکھا تھا: "چورا چکا چودھری اور غنڈی رن پہ دھان۔" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے لوگوں کی ٹانگوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیں سے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اور لُو کا بھبکا اس کے منہ پر پڑا تھا اور اس نے پلٹ کر نالی میں قے کر دی تھی، اور گو اس روز پتپتا نے ایک چھوڑ دو دو بار کہا تھا: "آج ہم نے ترکاری پکائی ہے۔" مگر وہ اس کی سُنی ان سُنی کر کے سیدھا اپنے گھر چلا آیا تھا اور اس کے بعد کئی روز تک کچھ کھا پی نہ سکا تھا۔ وہ جلدی سے مڑا اور اپنی گلی میں داخل ہوا جس کے آخر پر اس کا گھر تھا۔ گلی میں دروازوں اور کھڑکیوں پہ بیٹھی سہ پہر کی گپیں مارتی ہوئی عورتوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس نے جھجک کر کوٹ کا کالر اُٹھایا اور ہیٹ کو ماتھے پر کھینچ کر ہاتھ جیبوں میں دیے اور سامنے دیکھتا ہوا چلنے لگا۔ کوٹ کی دائیں جیب میں اُنگلیوں کی مدد سے اس نے پورے پونے چھ آنے کے سکّے گنے جو اب ساری دنیا میں اس کی کل دولت تھی۔ اب بادل سورج کے سامنے آ چکے تھے اور بارش کی خبر لانے والی مرطوب ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے دروازے پر پہنچا تو بارش کے پہلے قطرے اس کے ہیٹ پر پڑے۔

اس کا بیٹا دھپ دھپ کرتا اس کے آگے آگے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کھڑکیوں کے چھجوں پر شور مچاتے ہوئے بارش کے قطرے بڑی تیزی سے گر رہے تھے اور انہیں جذب کرتی ہوئی خشک دیواریں سوندھی سوندھی خوشبو چھوڑ رہی تھیں جو ایک بیش بہا خوش بُو تھی اور صرف موسم کے پہلے چھینٹوں پر اُڑتی تھی اور پھر نکل جاتی تھی، کہیں کی کہیں — اس نے زینے میں رک کر کئی لمبے لمبے سانس لیے اور گھر میں عورتوں کے ہنسنے کی مسرور آوازیں سنیں۔ اوپر پہنچ کر اس نے اپنی بھانجی کو دیکھا جو صحن میں لپک لپک کر رسی پہ پھیلے ہوئے گیلے کپڑے اُتار رہی تھی اور چارپائیوں کو گھسیٹ رہی تھی اور ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی بہن، جو ایک دوسری عورت کے ساتھ برآمدے میں چارپائی پہ بیٹھی تھی، اسے دیکھ کر بسم اللہ کر کے اُٹھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑی ہوئی۔ دوسری عورت نے مڑ کر دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ جیبوں میں ہاتھ دیے، کندھے جھکا کر چلتا ہوا صحن پار کر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر پھر کمرے کی دہلیز پہ قدم رکھتے رکھتے وہیں کا وہیں جم کر رہ گیا۔

اس کا دل یک بارگی اُچھلا اور پھر بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہوا میں معلق ہو گیا اور وہ مڑ کر دیکھ بھی نہ سکا، صرف سر جھکائے دروازے میں کھڑا یاد کرتا رہا اور بارش کے قطرے اکا دکا اس کے ہیٹ پر بجتے رہے۔

نوری!— اس کا ذہن گونج اُٹھا۔ نوری!!

اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کیے مگر دیواروں کی وہ اولیں نایاب خوش بُو اب نکل چکی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ وہ مڑا اور برآمدے کی چارپائی پہ بیٹھی ہوئی اس موٹی سی ادھیڑ عمر عورت کا پورا سامنا کر کے کھڑا ہو گیا۔

"نوری!!" اس کے ہونٹ ہلے مگر آواز پیدا نہ ہوئی۔ عورت مانوسیت اور حجاب کے ملے جلے تبسم کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ وہ آنکھیں پھیلائے کھڑا دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور بارش کے قطرے لمحوں کی طرح اس کے بے تاثر چہرے پہ گرتے رہے، ٹپ، ٹپ، ٹپ۔

"سعید! پانی پڑ رہا ہے۔" پھر اس کی بہن نے کہا۔

وہ جیسے خواب کی حالت میں مڑا اور دہلیز پر قدم رکھ کر اندر داخل ہوا اور جا کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا بیٹا باہیں پھیلائے کرسی پر بیٹھا بے خیالی سے باہر بارش کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہاتھ جیبوں سے نکالے بغیر کھڑا رہا اور پانی کے اکا دکا قطرے اس کے ہیٹ پر سے کندھوں پر اور آستینوں سے فرش پر گرتے رہے، ٹپ، ٹپ، ٹپ!— وہ اس وقت صرف گیارہ سال کا تھا اور یہ بیل کی طرح بل کھاتی، پل پل تھرکتی، دھم دھم کرتی سیڑھیاں چڑھتی اور اُترتی اور بھاگ کر گلی سے گزرتی ہوئی شہد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے رنگ کی لڑکی تھی جو گیارہ سالہ دل کا اکلوتا سحر تھی، نوری! — وہ بے خیالی سے ہنسا اور اس کا دل جیسے واپس اپنی جگہ پہ آگیا اور وہ آسانی سے ہولے ہولے سانس لینے لگا — وہ اس سے کئی سال بڑی تھی اور اس سے بات بھی نہ کرتی تھی مگر وہ گھنٹوں — پہروں اپنے دروازے سے لگ کر کھڑا (چوبارے پہ، کھڑکی میں، دروازے پر، گلی میں، اپنے گھر، اس کے گھر، کہیں، کہیں!) اس کی ایک جھلک کا منتظر رہتا تھا، اور دیکھ لیتا تو بہت اداس ہو جاتا تھا۔ اس گیارہ سالہ بچے کے لیے اس لڑکی میں ایک ایسا جادو تھا جو شاید سنہرے سے رنگ کا تھا اور جو اس کی ماں یا بہن یا باپ یا کسی اور مرد اور عورت میں نہیں تھا۔ دن بہ دن، ماہ بہ ماہ، سال بہ سال اس نے یاد کیا — وہ اس کی ایک ایک جھلک کا منتظر رہا تھا اور وہ اس سے بے خبر رہی تھی، قطعاً۔ حتیٰ کہ جب وہ گھر سے گیا تھا تو اس کے ساتھ ہی وہ بھی گئی تھی، وہی پل پل تھرکتی ہوئی سنہرے رنگ کی سدا بہار شبیہہ کہ اس کی اولین عورت تھی جو کبھی نہیں بھولتی۔ (وہ دوبارہ ہنسا، جیسے کسی ان دیکھی گہرج کو سن کر ان سنی کر رہا ہو۔) اس کے بعد کتنی ہی عورتیں اس کی زندگی میں آئیں اور نکل گئیں اور ایک کے بعد ایک کا سحر ٹوٹا، مگر ایک سحر قائم رہا اور ایک شبیہہ لازوال رہی جو اس کے دل کے ایک کونے پہ روشنی کے منار کی مانند کھڑی رہی اور ہر پرانے سحر کے ٹوٹنے پر نئے سحر کی جانب اسے چلاتی رہی اور جس کی جوانی کے زور پر وہ سدا جوان رہا تھا۔ اپنی ساری عمر اور عقل اور فہم اور تجربے کے باوجود اس کو کبھی اس بات کا خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا کہ ایک روز دوبارہ وہ اسے دیکھے گا اس طرح —

جیسے کوئی پتھر اڑتا ہوا آکر ایک جڑے ہوئے شیشے پہ لگے تڑاخ — اور شیشہ تڑخ کر کرچی کرچی ہو جائے مگر اپنے فریم میں کھڑا رہے جڑا جڑایا،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے ثابت و سالم، صرف سطح پہ کہ چیوں کی لکیریں پھیل جائیں چاروں طرف اور ہر کرچی سے ایک ٹوٹی پھوٹی شکل جھانکے الگ الگ۔ کہیں آنکھ کہیں ناک کہیں کان کہیں ہونٹ۔ جیسے کوئی خوفناک تصویر!

وہیں کھڑے کھڑے اس نے آہستہ سے گردن موڑ کہ دروازے سے باہر دیکھا۔ برآمدے میں چارپائی اب خالی پڑی تھی۔ اس کی بہن ایک کرسی اٹھائے چلی آرہی تھی جو اس نے لاکر اس کے پاس رکھ دی۔

"نوری ——" اس نے اپنی بہن کو کہتے ہوئے سُنا، "تم نے پہچانا؟ بے چاری کا میاں ——"

وہ سیدھا سیدھا کرسی پہ بیٹھ گیا اور گریبان کے بٹن کھول کر آہستہ آہستہ چھاتی پہ ہاتھ پھیرنے لگا، جیسے کہ چیوں کی لکیروں کو تلاش کر رہا ہو۔ باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی اور دیواروں پہ بچوں کے چاک اور گاچنی سے لکھے ہوئے نام اور نشان مٹتے جا رہے تھے۔ اس وقت بالکل ناقابلِ تشریح طور پہ اس کو وہ شاندار مرغ یاد آیا جو شاید سنہرے سرخ رنگ کا تھا اور ایک دفعہ دریا کے کنارے پانک پہ جا کر انہوں نے ذبح کیا تھا۔ اور ذبح کر کے رکھا ہی تھا کہ اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اس طرح کہ گردن کٹی ہوئی تھی اور ایک طرف کو لٹکا ہوا سر پھندنے کی طرح اُچھل رہا تھا اور وہ پَر پھیلائے بھاگا جا رہا تھا۔ وہ سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے تھے مگر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دریا میں جا گرا تھا اور دریا وہاں سے ایک دم گہرا تھا اور ان میں سے جو دو ایک تیرنا جانتے تھے وہ آگ جلانے کے لیے لکڑی کی تلاش میں اِدھر اُدھر جا چکے تھے چنانچہ مرغ پانی کی سطح پہ تیرتا تیرتا دریا کے بہاؤ میں شریک ہو گیا اور دور تک انہیں نظر آتا رہا تھا۔ وہ سب بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے صم بکم کنارے پر کھڑے دیر تک اسے دیکھتے رہے تھے اور پھر بعد میں خوب ہنسے تھے۔ اور اس نے حیرت سے سوچا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ مرغ پانی میں گرنے کے بعد ہلا تک نہ تھا تو پھر وہ اُٹھ کر بھاگا کیسے تھا!—

اور پھر اس کے بعد ایک دفعہ —— کئی سال گزرنے پر وہ مرغ اسے دوبارہ یاد آیا تھا اور اس وقت وہ منظر ذرا بھی مضحکہ خیز نہ رہا تھا بلکہ بڑا شدید المناک ہو گیا تھا جس نے اسے بہت اُداس کر دیا تھا۔ اور اس نے ذرا حیرت سے سوچا تھا کہ چیزوں کے ساحل کہاں ہوتے ہیں کہ اتنی عمر تک نظر ہی نہیں آتے؟

وہ دوبارہ بے خیالی سے، بے تاثر طور پر ہنسا، جیسے کوئی بچہ ڈری ڈری ہنسی ہنستے ہوئے قدم قدم کسی پالتو جانور کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا بچہ کرسی کی پشت سے لگا لگا سو چکا تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا اور ہاتھ کرسی کے بازوؤں پہ پھیلے تھے اور وہ گہرے گہرے، لمبے لمبے سانس لے رہا تھا جیسے باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور باہر بارش لگاتار ہوئے جا رہی تھی، جیسے سحر ٹوٹ جاتا ہے۔

اس نے ہیٹ ماتھے پر اونچا کیا، کوٹ کا کالر بٹھایا اور کھونٹی سے برساتی اُتار کر پہنی۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟" اس کی بہن نے پوچھا۔

"ذرا باہر جا رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"بارش ہو رہی ہے سعید!"

"بس ابھی آتا ہوں۔"

"سعید!" اس کی بہن نے ملتجی نگاہیں اٹھا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا، "اب یہاں رہو گے نا؟"

"ہاں۔" اس نے بے خیالی سے بے ماں کے بچے پر ایک نظر ڈالی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے کی طرف چل پڑا۔ پھر اچانک جیسے کچھ یاد آجانے پر مڑا اور بڑی بیباکی سے بہن کی آنکھوں میں دیکھ کر ہنسا۔

"ہاں۔" وہ بولا، "اب میں یہاں رہوں گا۔" اور صحن پار کر کے سیڑھیاں اُتر گیا۔

ڈیوڑھی میں اسے اپنی بھانجی ملی جو ہاتھ میں ایک خالی برتن لیے، دوسرے ہاتھ سے شلوار کے پائنچے اُٹھائے بارش میں بھیگتی ہوئی گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے اس کی ناک پکڑ کر آہستہ سے دبائی۔

"کہاں گئی تھی بلی؟"

لڑکی بیل کی طرح بل کھا کر مڑی اور پہلی بار پوری مانوسیت سے ہنس کر بولی: "ذرا ادھر گئی تھی ماموں۔"

دروازے میں رک کر اس نے دوبارہ ہیٹ اُتارا اور اسے خوب دبا کر سر کے پچھلے حصّے پر رکھا۔ پھر اس نے ہاتھ پھیلا کر بارش کے زور کا اندازہ کیا۔ سامنے کے گھر میں ایک نوعمر لڑکا دروازے سے لگ کر کھڑا بڑی مشتاق مگر اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باقی سب گھروں کے دروازے اَدھ کھلے یا بند پڑے تھے اور دور دور تک کوئی بشر دکھائی نہ دیتا تھا، سوائے چند چڑیوں کے جو بارش سے بچنے کے لیے کھڑکیوں کے چھجوں میں آکر چھپ گئی تھیں اور دھیمی، خواب آلود آوازوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بے خیالی سے مسکرایا اور گلی کے سرخ اینٹوں والے فرش پر ہلکے ہلکے خوش دل قدم رکھتا ہوا بازار کی جانب چل پڑا جہاں اب اسے اپنے پرانے جاننے والوں سے ملنا ملانا تھا۔ گلیاں اور محلے تقریباً ویران پڑے تھے۔ بارش شراٹے سے ہو رہی تھی اور دن کا اُجالا گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر کوئی شے بڑی نازک مگر قدیم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور زور آور ٹوٹ کر آزاد ہو چکی تھی اور لہو کے ساتھ گردش میں تھی۔
وہ دل کے سرہونے تک جیتا رہا تھا اور اس بات پہ نہ خوش تھا نہ خفا،
بس بارش کے اَن گنت قطروں کی تھاپ کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔
اور دل میں جانتا تھا کہ ان میں نہ رنگ ہے نہ بُو نہ لَے صرف حیات ہے۔

+++

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مہاجرین

(افسانہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

I am a refugee from the world –
— *Chateaubriand*

تیس برس قبل ایک حادثہ پیش آیا تھا جس نے آفتاب کی زندگی کو جکڑ کے رکھ دیا تھا۔ یہ کہانی اس حادثے کی کہانی ہے۔ جہاں تک حادثے کی نوعیت کا تعلق ہے کہا جاتا ہے کہ کوئی حادثہ بندھی ٹکی حدود کے اندر واقع نہیں ہوتا، اور نہ ہی ختم ہوتا ہے، بلکہ اس کی جڑیں آگے اور پیچھے دُور دُور کے ان دیکھے علاقوں میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جیسے آدمی کی زندگی وقت کی رسّی کے اندر اس طرح سے بٹی ہوئی ہوتی ہے کہ اس کے سرے نظر نہیں آتے، ہر چند کہ عمر کی حدود کے اندر قرار پاتی ہے۔ تاہم، آدمی کی ایک عمر ہی ایسی شے ہے جو اس کا کل سرمایہ ہوتی ہے اور ایک کہانی کی بنیاد کسی حادثے کی واقعیت پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ یہ کہانی بھی آفتاب کی زندگی کے صرف دو دنوں پر مشتمل ہے، گو یہ اور بات ہے کہ ان دو دنوں میں تیس برس کا وقفہ ہے۔

بیس جُون ۱۹۴۰

دن ڈھلنے لگا تھا مگر تپش کا وہی عالم تھا۔ آسمان جو کسی اور موسم میں شوخ نیلے رنگ کا ہوتا اس وقت چاندی کے گرم تختے کی مانند دہک رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ اوپر نظر نہ اُٹھتی تھی۔

شیخ عمر دراز اپنے بیٹے کے ہمراہ ظہر کی نماز پڑھ کے مسجد کی چٹائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ اُن کے بوٹ پہلو کے بل تلے سے تلا جڑے رکھے تھے۔ اُوپر ان کا خاکی سولا ہیٹ بوٹوں کو ڈھانپے ہوئے پڑا تھا۔ شیخ عمر دراز نے جُھک کر اپنی دونوں چیزیں اٹھائیں اور باہر کو چل پڑے۔ لڑکا اپنی چپلی باہر ہی چھوڑ گیا تھا۔ وہ صحن کی حد پر پہنچ کر بیٹھ گیا اور چپلی پہننے لگا۔

باہر نکلنے سے پہلے شیخ عمر دراز نے اپنا بڑا سا چوکور رومال ٹونٹی کے نیچے رکھ کر پانی سے تر کیا اور نچوڑ کر سر پر پھیلا لیا۔ پھر اس کے اُوپر انہوں نے احتیاط سے سولا ہیٹ جمایا۔ سفید رومال چھوٹے تولیے کے سائز کا تھا جس نے گردن کی پشت اور دونوں کانوں کو ڈھک لیا تھا۔ ماتھے پر کپڑا آنکھوں سے اُوپر اُوپر لہرا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے پہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہیٹ کو جھالر لگی ہو۔ شیخ عمر دراز کا رنگ سُرخ و سفید تھا اور ان کے چہرے کو دیکھ کر ذہن میں وہ پرانی پرانی تصویریں اُبھرتی تھیں جن میں انگریز افسر نیکریں یا برجس پہنے، سر پہ اسی صورت رومال اور ہیٹ لگائے، گرم صحرائی علاقوں یا جنگلوں میں کھڑے ہوتے تھے۔ شیخ عمر دراز کے چہرے پہ تاثر بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسا تصویروں میں انگریز افسروں کے چہروں پہ ہوتا تھا — یعنی انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ روزمرّہ کی دُنیا سے ذرا ہٹ کر واقع ہیں، گویا ایک متوازی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ شیخ عمر دراز کی نوعمری کی دشت نوردی نے صرف یہی دو نشانیاں چھوڑی تھیں: ایک جھالر والا ہیٹ، دوسری ان کے چہرے پر وہ دُور کی جھلک۔ چہرے سے نیچے وہ ایک عام آدمی کا نقشہ تھے۔ سفید شلوار قمیض اور بوٹ۔ صرف سردیوں میں کبھی کبھی وہ خاکی برجس اور فل بوٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنا کرتے تھے۔ مگر برجس پہن کر گھوڑے کی سواری کرنے کی بجائے سائیکل پر چڑھ کر اپنے دفتر جایا کرتے تھے، یا شام کو چھڑی ہاتھ میں گھماتے ہوئے اپنی زمین کا پھیرا لگاتے تھے۔

مسجد سے باہر نکلے تو دونوں باپ بیٹے کے مُنہ پر گرم ہوا کے تھپڑ آ کر پڑے۔

"آفتاب،" شیخ عمر دراز اپنے بیٹے سے بولے، "گھر چلے جاؤ۔ میں زمین سے ہو کر آتا ہوں۔"

"بابا اس وقت؟" بیٹے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں،" وہ بولے، "کچھ کام ہے۔"

"میں بھی جاؤں گا۔"

"اونہوں۔ لُو چل رہی ہے۔ تم گھر بھاگ جاؤ۔"

"بابا میں تو لیہ لے آتا ہوں۔" بچے نے ضد کی۔ "مجھے ساتھ لے جائیں۔ چند لمحے بے یقینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے شیخ عمر دراز راضی ہو گئے۔

"تو لیہ گیلا کر کے لانا۔" انہوں نے گھر کی جانب بھاگتے ہوئے بچے کو آواز دی۔

چند منٹ میں آفتاب گیلے تولیے سے سر اور منہ ڈھانپے واپس ان کے پاس آ پہنچا۔ وہ دونوں وہاں سے چل پڑے۔ گلیوں کی سُوکھی سفید دیواریں دُھوپ میں چمچما رہی تھیں۔ گرم ہوا کہیں سے چکراتی ہوئی آتی اور ان دیواروں سے ٹکرا کر آگ کی طرح اُچھلتی۔ دونوں باپ بیٹا تیز تیز چلتے ان گلیوں سے نکل گئے۔ ان کے دلوں میں اس وقت صرف ایک بات کا خیال تھا، کہ کس طرح جلد سے جلد وہ شہر سے نکل کر پکی سڑک پہ پہنچ جائیں جہاں سایہ دار درخت تھے۔ پانچ دس منٹ میں وہ شہر کی حدود تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچ چکے تھے۔

شہر اس وقت سنسان پڑا تھا۔ یہ شہر گو ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر تھا مگر مختصر سا درمیانی مزاج کا شہر تھا۔ چند مقام اس شہر میں ایسے تھے جو اسے ایک قصبے سے ممتاز کرتے تھے: ایک بازار، ایک ہسپتال، ایک جامع مسجد و عید گاہ، ایک ضلع کچہری، ایک سینما، ایک ہارس شو گراؤنڈ و جلسہ گاہ، ایک انٹرمیڈیٹ کالج، دو ہائی سکول۔ وسطی مقام سے کسی بھی رُخ بیس منٹ تک پیدل چلیں تو شہر کی حد ختم ہو جاتی تھی اور کھلی زمینیں اور کھیت شروع ہوتے تھے۔ جرنیلی سڑک پر پہنچ کر شیخ عمر دراز اور ان کا بیٹا آسانی سے سانس لینے لگے۔ سڑک کے دونوں جانب ٹاہلی اور شریں کے درخت تھے جن کے گھنے سائے میں ہوا کی حدت حل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سڑک پر وہ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک تانگہ آکر ان کے پاس رُکا۔

"آؤ شیخ جی۔" تانگے والا اگلی سیٹ پر ہاتھ مار کر اُسے صاف کرتے ہوئے بولا، "زمین پر چلے ہو؟"

"ہاں قربان۔" شیخ عمر دراز نے جواب دیا، "تم چلو۔ ہمیں دو قدم پر ہی تو جانا ہے۔"

"دو قدم ہو یا چار قدم حضور، یہ گھوڑا تانگہ آپ کا ہی ہے۔" وہ نیچے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔

تانگے میں دو سواریاں بیٹھی تھیں۔ ایک کسان آگے اور اس کی عورت سفید چادر میں لپٹی ہوئی پیچھے بیٹھی تھی۔ شیخ عمر دراز اگلی سیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور آفتاب خوشی خوشی پیچھے عورت کے ساتھ جا بیٹھا۔ عورت بہت سی سیٹ چھوڑ کر اپنے کونے میں سرک گئی۔ تانگے والا ایک پاؤں پائیدان پر اور دوسرا اُوپر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑا دوڑ پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شیخ جی ہمارے مائی باپ ہیں۔" تانگے والا بظاہر کسان سے مخاطب ہو کر بولا، "ان کی مہربانی سے ہماری روزی چلتی ہے۔"

دھوپ کی شدت سے پکی سڑک کی سطح جگہ جگہ سے پگھل رہی تھی۔ ان بڑے بڑے گداز دھبوں میں سے تانگے کے پہیئے کول تار کے نشان لے کر نکلتے اور سڑک پر لکیریں ڈالتے جاتے تھے۔ "ڈپٹی صاحب کے ہیڈ کلرک ہیں شیخ جی۔" تانگے والے نے فخر سے بتایا۔

کسان نے مرعوب ہو کر ایک نظر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے عجیب وغریب آدمی پر ڈالی اور تہمد سمیٹ کر ذرا پرے ہو بیٹھا۔

"بڑی ظالم گرمی پڑ رہی ہے شیخ جی۔" تانگے والے نے بات جاری رکھی، "بے زبان کی جان ہے، مجھے اپنے بچوں سے پیارا ہے۔ مگر پیٹ کا جہنم سب سے بڑا جہنم ہوتا ہے جی۔"

شیخ عمر دراز نے سر ہلایا: "یہ تو سچ ہے قربان۔"

دو فرلانگ تک جرنیلی سڑک پر جا کر تانگہ رک گیا۔ شیخ عمر دراز اور ان کا بیٹا تانگے سے اُتر پڑے۔ یہاں سے سڑک چھوڑ کر انہیں پگڈنڈیوں اور کھیتوں کی بتیوں پر چلتے ہوئے اپنی زمین تک جانا تھا۔ شیخ عمر دراز نے گھوڑے کی پشت پر تھاپ دی۔

"بڑا عمدہ جانور ہے قربان۔" وہ بولے، اور کئی لمحوں تک گھوڑے کے بدن کو دیکھتے اور آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے رہے۔

"میرے اختیار میں ہو تو اسے در دوازے پر کھڑا رکھوں شیخ جی۔" قربان فخر سے بولا، "مگر کیا کروں۔ پیٹ کا جہنم ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور گھوڑے کو پچکار کر دوڑا دیا۔

"بابا،" پگڈنڈی پر چلتے ہوئے آفتاب نے پوچھا، "یہ تانگہ آپ کا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیخ عمر دراز ہنسے۔ "وہ ایسے ہی بات کر رہا تھا۔ میں نے ابھی اگلے روز اسے پولیس سے چھڑوایا ہے۔"

"سپاہی سے؟"

"ہاں۔"

"اس نے کسی کو مارا تھا؟"

"نہیں۔ اپنے گھوڑے سے باتیں کر رہا تھا بیوقوف۔"

"گھوڑے سے باتیں کر رہا تھا؟"

"ہاں۔ کہہ رہا تھا پُتّر توں وگ جس طرح ہٹلہ وگ گیا اے۔" وہ ہنس کر بولے۔

"اور اسے سپاہی پکڑ کر لے گیا؟"

"ہاں۔ جنگ ہو رہی ہے نا۔ ہٹلر ہمارا دشمن ہے۔"

"بابا۔ ہم جنگ جیت جائیں گے؟"

"بیٹا نہیں۔ آثار تو اچھے نہیں۔"

پگڈنڈیوں پر وہ دھوپ سے دم لینے کے لیے کسی کیکر یا پُرانے پیپل کے سائے میں چند منٹ کو رُک جاتے، پھر چل پڑتے۔ گیہوں کی فصل کٹ چکی تھی اور خشکی سے تڑختے ہوئے سفید کھیت کے کھیت دور تک پھیلے پڑے تھے۔ اس سوکھی زمین پر گرم ہوا کے بگولے جگہ بہ جگہ گیہوں کے بچے کھچے تنکے اُڑا رہے تھے۔ صرف کہیں کہیں سبز چارے کا کوئی ایک آدھ کھیت کھڑا اس زمین کی آبادی کا پتا دیتا تھا۔ اب کسانوں نے بادل کی اُمید میں آسمان کی جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں صرف دو آوازیں ایسی تھیں جو آفتاب کے دل کو اچھی لگتی تھیں۔ ایک اونچی اُڑتی ہوئی چیل کی آواز اور دوسری گھگّو کی آواز۔ گھگّو کی خواب آلود آواز کو سُن کر اس کا دل کرتا تھا کہ وہ کہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر آرام سے بیٹھ جاتے اور اسے سُنتا رہے۔ اس میں سُنسان دوپہر کا مزا تھا اور اس آواز سے اُس کے بدن کا تعلق تھا۔ اس کے برعکس آسمان سے چیل کی چلچلاتی ہوئی آواز سُن کر اُس کا دماغ بھٹکنے لگتا تھا۔ اُسے دُور دُور کے خیال آتے تھے۔

"بابا،" اُس نے پوچھا، "دُعا کو اتنی جلدی کیوں ختم کر دیتے ہیں؟"

"کیا مطلب جلدی ختم کر دیتا ہوں۔"

"بس اِدھر ہاتھ اُٹھاتے ہیں اُدھر منہ پہ پھیر دیتے ہیں۔" بچے نے کہا۔

"اتنی ہی کافی ہوتی ہے۔"

"اتنی جلدی آپ کیا مانگتے ہیں؟"

"استغفار۔"

"استغفار کیا ہوتی ہے؟"

"معافی۔"

"کس کی معافی۔"

"گناہوں کی۔"

"آپ گناہ کرتے ہیں؟"

"بھئی جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ ہو جاتے ہیں۔"

"کیسے ہو جاتے ہیں۔"

"کبھی کسی کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ کسی کی بُرائی منہ سے نکل جاتی ہے۔"

"آپ کو پتا نہیں چلتا؟"

"کبھی چل جاتا ہے کبھی نہیں چلتا۔"

"کیسے؟"

"بھئی آدمی غلطی کا پتلا ہے۔" شیخ عمر دراز نے کہا۔